ماہا ملک

NOVELS KA JAHAN 📚📚

ہیلن گ نے شدت سے دکھتے ہوئے پپوٹوں کو ملا اور بمشکل آنکھیں کھول کر اپنے سامنے والی سیٹ پر بیٹھی اس نازنین کو دیکھا۔

اس نے آسمانی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ آسمانی رنگ کا باریک دوپٹا اس کے سیاہ بالوں کے لشکارے چھپانے سے قاصر تھا۔ ایک لانبی، شریر

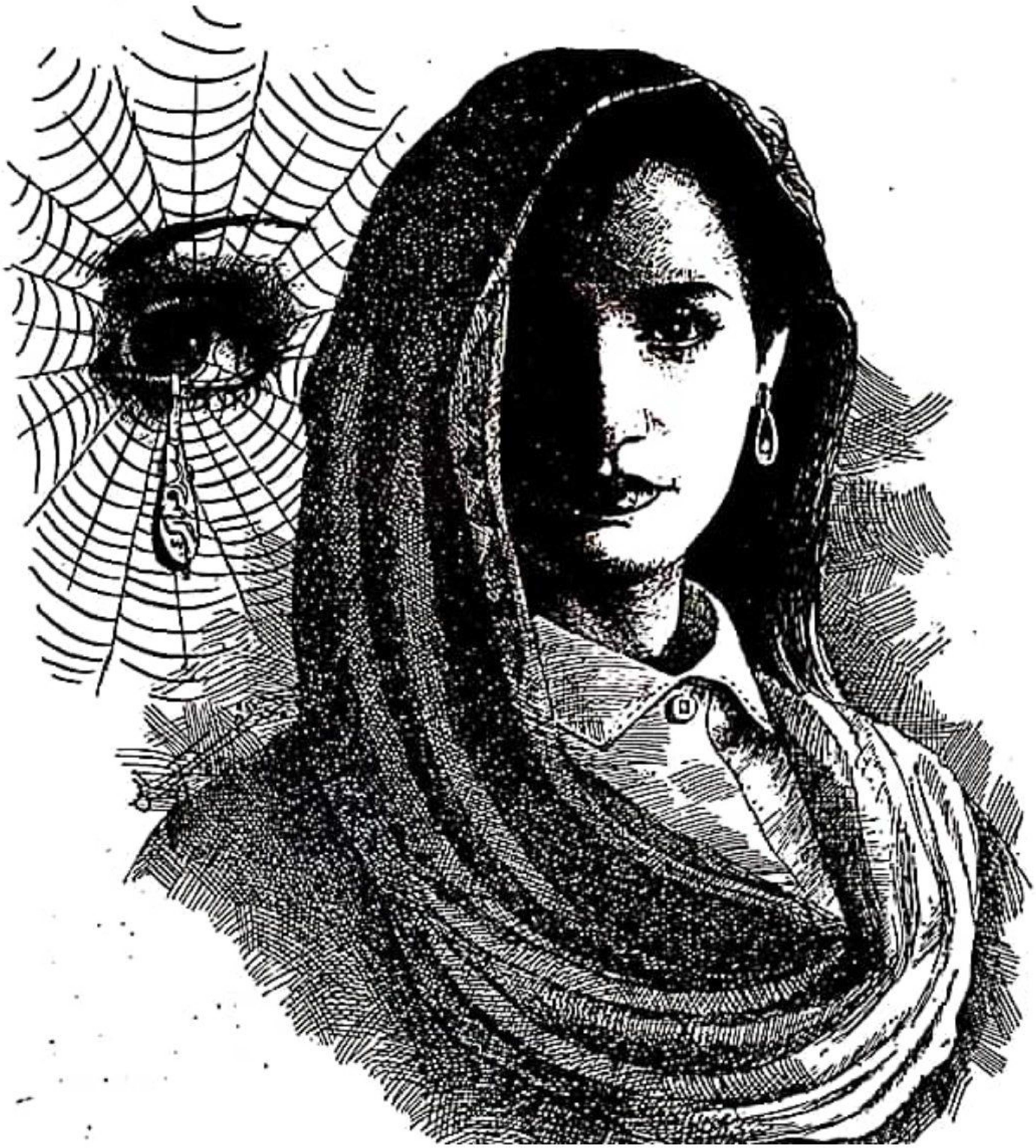

Scanned with CamScanner

سی لٹ اس کے گال سے بار بار ٹکرا رہی تھی جسے وہ شہادت کی انگلی سے کان کے پیچھے کر کے اور لٹ پھر مسکرا کر سر نکال لیتی تھی۔ لٹ کی شرارت بھری مسکان سے قطع نظر اس کا اپنا چہرہ قطعاً سنجیدہ تھا اور لب ہلکی سی سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔

پھر میں نے سامنے میز پر پڑے ہوئے اس کاغذ کو دیکھا۔ یہ علی کا خط تھا۔ سفارش نامہ، جو وہ نازنین اپنے پرس میں اس اسٹینڈ پر رکھ کر لائی تھی کہ میں اسے پڑھتے ہی اسے نوکری دے دوں گا۔ اس کی اسٹینڈ کچھ ایسی غلط بھی نہ تھی۔ علی میرا بہترین دوست تھا۔ ہم ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ اور میں اس کی سفارش ہرگز رد نہ کر سکتا تھا۔ اول تو وہ بے جا سفارش کا قائل نہ تھا، دوسرے وہ انتہائی مجبوری کی حالت میں کوئی ایسا قدم اٹھاتا تھا۔

خط کے الفاظ پر سے میری نظریں پھسلتی ہوئی اس کی آپس میں الجھی ہوئی انگلیوں میں جا ٹکیں ــ میز پر دھرے ان ہاتھوں میں ایک عجب ارتعاش سا تھا۔ شاید وہ نروس ہو رہی تھی۔ جب کوئی میرے سامنے بیٹھ کر نروس ہونے لگے تو مجھے لطف محسوس ہوتا ہے شاید اس لیے کہ ایک زمانے میں میں بھی بڑا نروس شخص تھا۔ جب میں کسی نوکری کے لیے ہونے والے انٹرویو کے لیے کسی بورڈ کے ممبران کے سامنے جا کر بیٹھتا تو میرا برا حال ہو جایا کرتا تھا اور کانپتی انگلیوں کو آپس میں سختی سے الجھا کر میں ہمیشہ اپنی گود میں رکھ لیا کرتا تھا اور سب سے پہلے ایک گلاس پانی مانگا کرتا تھا۔

"سر۔ ایک گلاس پانی مل سکتا ہے؟" میرے کانوں سے اس کی آواز ٹکرائی۔

میں نے اس کے روشن چہرے پر ایک نگاہ ڈالی اور گھنٹی بجا کر چپراسی سے پانی لانے کے لیے کہا۔

"کیا نام بتایا آپ نے؟" میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

ہرچند کہ اس کی فائل میرے سامنے پڑی تھی جس پر موٹے موٹے حروف میں ربیعہ انصاری لکھا تھا۔ اور کمرے میں داخل ہونے کے بعد وہ مجھے دو مرتبہ اپنا نام بتا چکی تھی، جو مجھے یاد بھی تھا۔

"جی۔ ربیعہ۔ ربیعہ انصاری۔"

اس نے پانی کا گلاس جلدی سے لبوں سے ہٹا کر جواب دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سا پانی اس کے کپڑوں پر چھلک گیا۔ گلاس میز پر رکھ کر وہ شرمندگی سے اپنے کپڑے جھاڑنے لگی۔ ٹشو پیپر کا ڈبہ میں نے خاموشی سے آگے کر دیا۔

اس کی آنکھیں بتاتی تھیں کہ وہ بڑی شرمیلی طبیعت رکھتی ہے اور ناک کی بناوٹ سے اس کے انتہائی خوددار اور رحم آمیز ہونے کا پتا چلتا تھا۔ ہونٹوں کے کناروں سے علم ہوتا تھا کہ وہ اتنی کم گو نہیں ہے، لیکن محتاط ہے۔

اس کی فائل سے پتا چلتا تھا کہ وہ اپنے اندر خاصی قابلیت رکھتی ہے اور کوئی گئی گزری لڑکی نہیں، لہٰذا اس کی گھبراہٹ کی وجہ غالباً یہ ہو سکتی تھی کہ وہ ایک عدد سفارشی خط لے کر میرے پاس آئی تھی۔ اور اس بات پر مجھ سے اور خود سے شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

"مس ربیعہ انصاری۔" میں نے خط اپنی دراز میں ڈال لیا۔ "آپ کل سے آ سکتی ہیں۔ میں آپ کا اپائنٹمنٹ لیٹر ٹائپ کروائے دیتا ہوں۔ ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ آپ کر تی ہے۔ ڈکٹیشن بھی آپ اچھا ہی کریں گی۔ آپ کا تعلیمی ریکارڈ اچھا ہے۔ آپ کی میز یہیں میرے کمرے میں ہوگی۔"

"اوہ!" نجانے کب کا قید سانس اس کے سینے سے برآمد ہوا تھا۔

میں نے لب کو دانتوں سے دبا کر مسکراہٹ کو روکا۔ اور سنجیدہ رہنے کی کوشش جاری رکھی۔

"فی الحال آپ کی تنخواہ چھ ہزار روپے ماہوار ہے۔ بعد میں اس میں اضافہ ہو جائے گا۔ اور ہوتا رہے گا۔"

"تھینک یو سر! تھینک یو ویری مچ۔" اس کی آنکھیں سچ مچ بھر آئیں۔

"بکا مچ کی گڑیا" میرے ذہن نے فوراً اس منظر پر کیپشن لگایا۔

نجانے کیا بات ہے، ہر منظر، ہر سچویشن پر میرا ذہن کوئی نہ کوئی عنوان ضرور فٹ کرتا ہے۔ اس کے

Scanned with CamScanner

جانے کے بعد میں نے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ جلتی ہوئی آنکھیں بند کرنے سے کیسی لذت آمیز تکلیف ہوتی ہے۔ گزشتہ رات جاگتے رہنے سے میری آنکھیں اب لال بھبھوکا ہوئی تھیں جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

"میں تم سے بیزار ہو چکا ہوں۔ تمہاری صورت سے نفرت ہو چکی ہے مجھے۔ تم پر نگاہ پڑتے ہی میرا اچھا بھلا موڈ بھی غارت ہو جاتا ہے۔ آئی ہیٹ یو۔ آئی ہیٹ یو۔"

یہ میرے آخری الفاظ تھے۔ جو میں نے رات کو عنبرین سے کہے تھے۔ اس کے بعد وہ ڈائننگ روم میں جا کر الماری سے کانچ کے برتن نکال نکال کر توڑنے میں مصروف ہو گئی تھی۔ لڑائی سے فارغ ہونے کے بعد ذہن کو فریش کرنے کے لیے یہ اس کا بہترین شغل تھا۔ تین چار قیمتی ڈنر سیٹ، دو تین ٹی سیٹ وغیرہ توڑ کر اس کی اس روحانی مشق کا اختتام ہوتا تھا اور پھر وہ اپنے کمرے کا دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند کر کے سو جاتی تھی۔ اور میرے دماغ میں بقیہ ساری رات برتنوں کی آوازیں گونجا کرتی تھیں۔

"چھن، چھن، چھناک، چھناک۔"

"سر! سر آپ کو چائے بنا دوں۔"

میں نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔

نعمانہ میرے مقابل کھڑی تھی۔ نجانے اسے کیسے علم ہو جاتا تھا کہ میں عنبرین سے کب لڑتا ہوں۔ دوسرے دن وہ میرا بڑا خیال رکھتی تھی۔

"جی مس نعمانہ۔ پلیز۔"

وہ دو کپ چائے بنا کر لے آتی اور اپنا کپ لے کر میرے مقابل بیٹھ گئی۔

یہ اس کی مخصوص عادت تھی۔ میں جب بھی چائے کی طلب کرتا، وہ دو کپ چائے بناتی اور اپنا کپ لے کر میرے سامنے بیٹھ کر پیا کرتی تھی۔ اپنی ملازمت کے پہلے دن سے اس لڑکی نے میرے قریب آنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ لیکن عنبرین میری زندگی میں آنے والی پہلی اور اب تک آخری لڑکی تھی۔ دراصل میری زندگی میں آنے کے بعد اس نے مجھے لفظ "عورت" سے اتنی چڑ دلا دی تھی کہ دوسری کسی عورت کے آنے کا کوئی راستہ چھوڑا ہی نہ تھا۔ اور پُرلطف بات یہ تھی کہ میری اور اس کی ہر لڑائی کی بنیادی وجہ اس کا وہ شک تھا جو وہ مجھ پر کسی دوسری عورت کے مجھ سے دس فٹ کے فاصلے سے گزر جانے پر بھی کیا کرتی تھی۔ اس کے اس شک نے میری زندگی کانٹوں کی سیج بنا دی تھی۔ مجھے زندگی اور عورت دونوں سے نفرت ہو چکی تھی۔ ایسے میں بھلا کسی نعمانہ یا نغمانہ کی کیا چلنی تھی؟

عنبرین سے میری شادی کسی افیئر کا نتیجہ نہ تھی۔ مجھ سے پہلے یہ بزنس اس کے والد سنبھالا کرتے تھے اور میں اُن کے آفس میں ایک معمولی کلرک کے طور پر بھرتی ہوا تھا۔ بعد ازاں میری صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے وہ مجھے ترقی پر ترقی دیتے گئے۔ اور پھر ایک دن ان نوازشات کا پول بھی کھل گیا جب انہوں نے مجھے اپنا سارا بزنس سنبھال لینے کی آفر کی۔ لیکن اس شرط پر کہ میں ان کی اکلوتی بیٹی سے شادی کر لوں۔

میں نہیں جانتا، عنبرین میں کیا کمی، یا کون سی خامی تھی جو انہیں ازخود اپنی بیٹی کے لیے کسی شخص سے کہنا پڑا۔ وہ قبول صورت پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ البتہ مزاج کی ازحد تیز تھی۔ بعد میں اس کے مزاج کی یہ تیزی اور تلخی میری پوری زندگی میں گھل گئی۔

وہ سمجھتی تھی کہ مجھ سے شادی کر کے اس نے مجھ پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ اتنا بڑا بزنس محض اس کی وجہ سے مجھے مل گیا ورنہ میں تو ساری عمر فٹ پاتھوں پر جوتیاں چٹخاتا رہتا۔ اسے وہم رہتا تھا کہ میں دوسری عورتوں سے جان بوجھ کر فری ہونے کی کوشش کرتا ہوں۔ دعوتوں میں وہ مجھے بار بار ٹہوکے دے کر اپنی جانب متوجہ کیے رکھتی اور واپسی میں پوچھتی۔

"یہ تم بلاوجہ مسز عثمانی کے گلے کا ہار کیوں بنے جا رہے تھے؟"

"کیا میں دیکھ نہیں سکتی کہ تمہاری نگاہیں کہاں ہوتی ہیں؟ تم عالیہ احمد کی بلائیں نگاہوں ہی نگاہوں میں لے رہے تھے۔ بس چلتا تو اسے اپنے ساتھ اٹھا لاتے۔"

"تحریم علی سے اس قدر جھک کر بات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ گود میں بیٹھ جاتے ناں اس کی۔"

"یا خدا!" میں اپنا سر تھام لیتا۔ آخر میں بھی انسان

Scanned with CamScanner

تھا۔ مرد تھا، جوان تھا۔ بھولے بھٹکے، دانستہ یا نادانستہ نگاہ کسی سمت اٹھ ہی جاتی تھی۔ نگاہوں کے پر تو نہیں ہوتے جنہیں میں کاٹ ڈالتا۔ پیر بھی نہیں ہوتے جنہیں زنجیریں ڈال دیتا۔

وہ مجھے جتنا احساس دلاتی اتنا ہی میری نظریں دوسری جانب اٹھا کرتیں۔ اس کھینچا تانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے محفلوں، دعوتوں میں جانا انتہائی کم کر دیا۔ وہ مجھ سے کہیں چلنے کا کہتی، میں صاف انکار کر دیتا۔ وہ شاپنگ کے لیے ضد کرتی میں جان بوجھ کر دیر سے گھر جاتا۔ وہ فلم پر چلنے کے لیے اصرار کرتی میں اسے مشورہ دیتا، اپنی کسی سہیلی کے ساتھ چلی جاؤ، اسکرین پر ہیروئن آئے گی، خواہ مخواہ میری آنکھیں سنکیں گی۔

ہمارے درمیان خلیج بڑھتی چلی گئی۔ زندگی کی رسی کو تھام کر چلنے کے بجائے ہم دونوں دو انتہائی سروں پر چلے گئے اور روزمرہ کی لڑائیاں ہمارا معمول بن گئیں۔ اس تپتے ریگزار میں ننگے پاؤں چلتے ہوئے بارش کا جو پہلا قطرہ میرے لبوں سے ٹکرایا، اس کا نام ربیعہ انصاری تھا۔

آسمانی رنگ میرا فیورٹ تھا۔ شاید اس کا بھی تھا۔ وہ عموماً آسمانی رنگ کا لباس زیب تن کرتی تھی۔ اس رنگ میں اس کی رنگت چمکنے لگتی تھی اور اس کی بادامی آنکھوں میں نیلے سمندروں کا عکس آجاتا تھا۔ آسمانی دوپٹے کے نیچے سے اس کے بال اپنے گہرے سیاہ ہونے کا بھرپور احساس دلاتے تھے اور اس کی آنکھوں میں کاجل کی خوت نمایاں ہو جاتی تھی۔ ناک کی لونگ مزید لشکارے مارتی تھی اور لبوں کی گلابیاں واضح ہو جاتی تھیں۔ لیکن۔ شاید یہ سب کچھ میرا وہم تھا۔ وہ تو مجھے ہر رنگ میں اچھی لگتی تھی۔

اس دن وہ نو بجے تک نہیں آئی۔ میں ٹھیک پونے نو بجے آفس پہنچ جاتا تھا تاکہ دیکھ سکوں کہ کون کتنا وقت کا پابند ہے۔

ربیعہ انصاری مجھے ہمیشہ اپنی سیٹ پر ملتی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ احتراماً کھڑی ہوتی اور رسماً مسکراتی تھی۔ لیکن آج وہ اپنی سیٹ پر موجود نہ تھی۔ میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔

"کیا آج وہ نہیں آئے گی؟ کیا اس نے چھٹی کر لی ہے؟ لیکن اس کا فرض تھا کہ مجھے پہلے سے مطلع کرتی۔"

میں نے اپنی کرسی پر بیٹھ کر نعمانہ کی سیٹ کی ہوئی فائلیں اپنے آگے کھسکائیں اور رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی۔ اس کے نہ آنے کے تصور سے میں نجانے کیوں پریشان ہو رہا تھا۔ شاید وہ میرے لیے سکون اور دوائی کی حیثیت تھی جسے محض اپنے سامنے رکھا دیکھ کر میں مطمئن رہتا تھا۔ عنبرین کی کڑوی کسیلی باتوں کے بعد اس کا نظارہ وہ میٹھی گولی تھا جسے میں نظروں کے ذریعے اپنی زبان پر رکھتا اور دھیرے سے نگل کر ہر غم سے آزاد ہو جایا کرتا تھا۔ اس کی خالی سیٹ سے مجھے وحشت ہونے لگی۔

سوا نو بجے وہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

"اوہ" مجھے اپنی جگہ پر دیکھ کر وہ وہیں رک گئی۔ "حاضر ہو سکتی ہوں سر؟"

"آئیے پلیز!" میں مسکرایا۔ "آج آپ نے دیر کر دی؟"

"جی سر۔ وہ میری بس نکل گئی تھی۔" اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ "مزید یہ کہ لفٹ میں کچھ خرابی ہو گئی ہے میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی۔ دس منٹ اس میں لگ گئے۔"

"اوہ۔ آئی سی۔ لیکن آپ کی بس کیوں نکل گئی؟"

"تیرا حسن ترے حسن بیاں تک دیکھوں" کے شوق نے مجھ سے جرح کا سلسلہ جاری کروانے رکھا۔

"بس سر۔ وہ" وہ خجل سی کھڑی تھی۔

تب میں نے دیکھا۔ سفید آنچل کے اندر اس کے لانبے سیاہ بال اس کی کمر تک آرہے تھے۔ اور ان کے سروں پر پانی کی ننھی ننھی بوندیں ٹھہری ہوئی تھیں۔ وہ نہا کر آئی تھی اور شاید اسی لیے لیٹ ہو گئی تھی۔ ورنہ تو وہ ان زہریلی ناگوں کو ایک سخت چوٹی میں مقید رکھا کرتی تھی۔

"مس انصاری۔ آپ کھڑی کیوں ہیں؟" میں نے نرم لہجے میں دریافت کیا۔

اس نے قدرے چونک کر میری جانب دیکھا۔ شاید لہجہ نرم ہونے کے ساتھ ساتھ روینٹک بھی ہو گیا تھا۔

Scanned with CamScanner

وہ خاموشی سے اپنی سیٹ کی جانب بڑھ گئی۔ اور میں کھنکار کر فائلوں پر جھک گیا۔

بادل بُری طرح سے گھِر آئے تھے۔ اور بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ ہوا میں ٹھنڈک، خنکی، خوشبو، مستی سبھی کچھ در آیا تھا۔ یہ میرا پسندیدہ موسم تھا۔ اس موسم میں میرا جی چاہتا میں کچی مٹی پر لیٹ جاؤں اور اس کی ساری ٹھنڈک، ساری خوشبو اپنے اندر اتار لوں۔

ٹی شرٹ اور ٹراؤزر پہن کر میں لان میں آ گیا۔ عنبرین اپنے کمرے کا دروازہ مقفل کیے سو رہی تھی۔ یہ اس کی بدمذاقی کی بڑی واضح دلیل تھی۔ ایسے موسم میں وہ ہمیشہ کھڑکیاں بند کر کے، پردے گرا کے سو جاتی تھی۔ بقول اس کے، اسے اس اندھیرے ماحول سے گھٹن ہوتی تھی۔

میں لان میں چہل قدمی کرتا رہا۔ کریم مجھے کافی کا مگ تھما گیا تھا۔ موسم کا لطف گرم گرم کافی دوبالا کر رہی تھی۔ کیاریوں میں جھومتے گلابوں سے اٹکھیلیاں کرتی ہوا جب مجھ سے ٹکراتی تو میں جلدی سے ساری خوشبو اپنے اندر اتار لیتا۔

چلتے چلتے میں مڑا تو دیکھا۔ عنبرین اٹھ کر باہر آ چکی تھی۔ سیاہ شال لپیٹے وہ لان کے دوسرے سرے پر کھڑی تھی۔ ایک تو مجھے سیاہ رنگ سے جتنی وحشت ہوتی تھی، وہ اتنا ہی اس رنگ کو اپنے ملبوسات میں جگہ دیتی۔ یہ رنگ اس کی بے رونقی میں مزید اضافہ کرتا تھا۔ شاید اس کو اندازہ نہ تھا۔

"وہاں کھڑی کیا کر رہی ہو۔ یہاں آ جاؤ۔"

میرا موڈ خوشگوار تھا۔ میں نے اسے پکار لیا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی مجھ تک آ گئی۔

"حیرت ہے۔ تم اتنی جلدی اٹھ گئیں۔ وہ بھی اس گھٹے ہوئے ماحول میں؟" میں نے اسے چھیڑا۔

"تم تو چاہتے ہو گے کہ میں سوتی رہوں۔" اس کے لہجے میں طنز پوشیدہ تھا۔

اس کے اس طنزیہ لہجے سے میرے اندر تک آگ بھڑک اٹھی تھی۔

"کیوں بھئی۔ میں کیوں ایسا چاہوں گا؟" لازمی امر تھا کہ میرا لہجہ بھی خشک ہو جاتا۔

"تاکہ میری غیر موجودگی میں جی بھر کر عیاشیاں کر سکو!"

"کیسی عیاشیاں!" میں تنک کر اس کی جانب مڑا۔ پھر میں نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ سامنے والے بنگلے کے ٹیرس پر دو لڑکیاں کھڑی موسم کو انجوائے کر رہی تھیں۔

"اوہ!" میں نے گہری سانس لی۔

"اب کہہ دو کہ تم نے تو انہیں ابھی ابھی دیکھا ہے۔" وہ پھر طنزیہ مسکرائی۔

"نہیں۔" میں قطعاً سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "میں تو انہیں پچھلے دو گھنٹوں سے تاڑ رہا ہوں۔"

اپنی بات کا کوئی تلخ سا جواب سنے بغیر گملوں کو ٹھوکریں مارتا اپنے لمبے ڈگ بھرتا میں اندر آ گیا۔

بڑی عجیب عورت تھی۔ اس نے زندگی میں محض ایک فن سیکھا تھا۔ خوشیوں کو پامال کرنا اور کرتے رہنا۔ اس سے آگے اسے کچھ علم نہ تھا۔ پیار، محبت، اعتماد، اعتبار، رشتوں کا تقدس یا احترام، وہ ہر شے سے عاری تھی۔ وہ بس اتنا جانتی تھی کہ بحیثیت ایک بیوی کے شوہر پر اندھا شک کرنا اس کا حق ہے۔

میں نے کمرے سے گاڑی کی چابی لی اور باہر آ کر کسی بھی جانب دیکھے بغیر گاڑی نکال کر سڑکوں پر لے آیا۔ گھر سے دُور رہنا اس نے میری مجبوری بنا دی تھی۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کس نقطے سے اپنی زندگی کی ابتدا کروں۔ اس ڈانواں ڈول ناؤ کو کیسے متوازن رکھوں۔ خوشیاں کس مٹھے سے کشید کروں، عمر کیسے بسر کروں۔

گاڑی لے کر میں سڑکوں پر بلا مقصد اور بنا کسی جواز کے پھر رہا تھا۔ یکایک سائیڈ مرر میں ایک چہرا اُبھرا اور دُور ہوتا چلا گیا۔ میں نے بریک لگائے اور گاڑی ریورس کر کے لایا۔

وہ بلاشبہ ربیعہ تھی۔ اس کے ساتھ دو لڑکیاں اور تھیں۔ چپس کے پیکٹ تھامے، ہنستی مسکراتی وہ غالباً موسم کا لطف اٹھانے گھر سے نکلی تھیں۔ دھانی کپڑوں میں، بلا تکلف قہقہہ لگاتی ربیعہ میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی۔

"ربیعہ!" میں خود کو اسے پکارنے سے نہ روک سکا۔ وہ چونک کر مڑی تھی۔

"سر آپ" مجھے اچانک سامنے پا کر وہ ہکا بکا رہ گئی۔

پھر اپنی ساتھی لڑکیوں کو قدرے پیچھے چھوڑ کر وہ آگے بڑھ آئی۔

"جی سر!" وہ ذرا سا جھکی۔ اسی شریر لٹ نے سر نکالا اور اس کے گال کے ساتھ ساتھ لہرانے لگی۔

"کہاں جا رہی ہیں اس موسم میں؟" میں مسکرایا۔

"کون ہیں آپ کے ساتھ؟"

"میری فرینڈز ہیں سر" وہ بتلاتے کیوں خجل سی تھی۔ "ہم یونہی ذرا گھومنے نکلے تھے"

"اگر آپ کی فرینڈز سے کچھ دیر کے لیے آپ کو چرا لیا جائے تو؟"

اس نے نظریں چرا لیں۔

"چلیں۔ کچھ ایسا ضروری بھی نہیں" میں نے اس کا گریز بجانپ کر گاڑی اسٹارٹ کی۔

"نہیں نہیں سر۔ ایسی بھی بات نہیں" پھر اس نے مڑ کر انہیں آنے کا اشارہ کیا: "انہیں آپ ہاسٹل اتار دیں گے؟"

"ضرور" میں نے مسکرا کر پیچھے کا لاک کھولا۔ پھر جھک کر فرنٹ ڈور کھول دیا۔ وہ گھوم کر آئی اور دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

"آپ کی تعریف؟" پیچھے سے چنچل آواز ابھری۔

"مجھے منہاج کہتے ہیں"

"میں انہیں کے آفس میں تو کام کرتی ہوں" ربیعہ نے مڑ کر وضاحت کی "سر! یہ دونوں میری بہت اچھی فرینڈز ہیں"

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"یہ بینکا ہیں اور یہ عائشہ"

"خوشی ہوئی آپ لوگوں سے مل کر" میں نے رسماً کہا۔

ان دونوں کو ویمن ہاسٹل اتار کر میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"آپ۔ ہاسٹل میں رہتی ہیں؟" میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"جی" اس نے مختصراً کہا۔

"کیوں؟"

"پھر کہاں رہوں سر؟" وہ مسکرائی۔

میں گڑبڑا سا گیا۔

"میرا مطلب ہے آپ کا گھر؟"

"میرا کوئی گھر نہیں ہے سر" وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولی: "ایک والدہ ہی کا سہارا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد قرض وغیرہ اتارنے کے لیے مجھے گھر بیچنا پڑا۔ کچھ عرصہ اسی رقم سے گزارا کرتی رہی۔ لیکن پھر احساس ہوا کہ کرائے کے گھر بہت مہنگے ہیں اور رقم بہت قلیل۔ علی صاحب ہمارے پڑوسی ہیں۔ انہیں کی معرفت آپ کے آفس میں یہ جاب بھی مل گئی اور ہاسٹل میں کمرا بھی، خدا انہیں خوش رکھے"

اگر علی شادی شدہ نہ ہوتا اور اپنی بیوی سے بے تحاشا محبت نہ کرتا تو شاید اس وقت میں حسد میں مبتلا ہو جاتا۔ لیکن چونکہ میں صورتِ حال سے واقف تھا لہٰذا خوش دلی سے کار ڈرائیو کرتا رہا۔

"لیکن ہم کہاں جا رہے ہیں سر؟" اسے دفعتاً خیال آیا تو وہ پریشان سی ہو گئی۔

"بے فکر رہیں۔ آج چھٹی ہے، آفس نہیں جا رہے"

وہ دھیرے سے ہنس دی۔

"میں کام سے گھبراتی تو نہیں ہوں سر۔ جو آپ طنز کر رہے ہیں"

"نہیں! میں طنز نہیں کر رہا ہوں۔ طنز سے تو مجھے سخت نفرت ہے" میں بولا۔ "ہم ساحلِ سمندر پر جا رہے ہیں"

"کیوں سر؟"

"موسم انجوائے کرنے۔ کیا آپ ہاسٹل سے انجوائے کرنے نہیں نکلی تھیں" میں نے خوش دلی سے دریافت کیا تو وہ خاموش ہو گئی۔

وہ دن بڑا خوبصورت دن تھا۔ ہم دونوں دیر تک سمندر کے کنارے ٹہلتے رہے۔ باتیں کرتے رہے ہنستے رہے۔ پھر میں نے اسے اچھا سا ڈنر کرایا اور رات کو آٹھ بجے ہاسٹل کے گیٹ کے سامنے اتار دیا۔

مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ اتنی خشک نہیں جتنی کہ دکھائی دیتی ہے۔ وہ کھلتی ملتی بھی تھی اور ہنستی مسکراتی بھی تھی لیکن اپنی ذات کی حفاظت بڑے محتاط طریقے سے کیا کرتی تھی۔ اس پوری ملاقات کے دوران مجھے

Scanned with CamScanner

اس پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالنے کی ہمت بھی نہ ہوئی۔ وہ واقعی ایسی لڑکی تھی جس سے محبت کی جا سکتی تھی۔

زندگی اچانک اس قدر خوش گوار ہو جائے گی، میں نے کبھی گمان تک نہ کیا تھا۔

عنبرین احمد نے مجھے ذہنی طور پر اتنا مایوس، اتنا شاکڈ کر دیا تھا کہ میری تمام تر لطیف حسیات مر سی گئی تھیں۔ اگر کبھی کبھی سر اٹھاتیں بھی تو وہ اپنی ترش روئی کے ڈنڈے برسا برسا کر انہیں دوبارہ گہری نیند سُلا دیتی۔

کہتے ہیں انسان جس چیز سے بے تحاشا خوف زدہ رہے۔ وہ ہو کر رہتی ہے۔ اسے محض وہمی ایک خوف تھا کہ میری زندگی میں اس کے علاوہ کوئی دوسری عورت نہ آ جائے۔ میں ہینڈسم تھا، جوان تھا۔ اس سے شادی کر کے نکھٹو بن چکا تھا۔ ایسے میں اس کا اندیشہ ایسا کچھ بے بنیاد بھی نہ تھا۔ لیکن میں سوچتا ہوں، اگر وہ اس بات کو اپنے لیے ایک روگ نہ بنا لیتی اور اپنی دانست میں مجھے براہِ راست پرکھنے کے یہ غلط اور بے ہودہ طریقے نہ اپناتی، تو شاید ایسا کبھی نہ ہوتا۔ میں تو بڑا قناعت پسند تھا۔ میں نے اسے بیوی کے روپ میں پہلے دن سے قبول کر لیا تھا۔ نہ اس سے پہلے کبھی میں نے کسی میں دلچسپی لی تھی اور نہ ہی بعد میں ایسا کچھ کرنے کا سوچا تھا۔ لیکن اس نے ذرا سے اندیشے کو اپنا روگ اور میری چڑ بنا ڈالا۔ اس نے اتنی احتیاط دکھائی، اتنی احتیاط دکھائی کہ بالآخر میں اس کے جور و ستم سے گھبرا کر ربیعہ انصاری کی گھنی زلفوں کی چھاؤں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔

میں نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ میں عنبرین کی جگہ کسی اور کو دوں، اور نہ ہی اب میرا ایسا کوئی ارادہ تھا۔ میں جانتا تھا ربیعہ انصاری سے میں کسی صورت شادی نہ کر سکتا تھا۔ ایسی صورت میں مجھے کس کس شے سے محروم ہونا پڑتا، مجھے پوری طرح سے علم تھا۔ میرے لیے تو بس وہ ایک شجرِ سایہ دار کی مانند تھی، جس کی چھاؤں میں میں ایک تھکے ہارے مسافر کی مانند چند گھڑیوں کے لیے رُک گیا تھا۔ اس چھاؤں کو چھوڑ کر تپتے ہوئے ریگزار میں مجھے پھر آگے بڑھنا تھا مجھے اچھی طرح سے علم تھا۔

یہی وجہ تھی کہ زندگی کے ان لمحات سے میں خوشیوں کا آخری قطرہ بھی کشید کر لینا چاہتا تھا۔

”مجھے تمہارے بال بہت پسند ہیں۔“ میں نے اس کے گال سے کھیلتی لٹ کو انگلی سے دھیرے سے چھوا۔ ”تم انہیں کھولتی کیوں نہیں ہو؟“

اس نے خاموشی سے لٹ پیچھے کر لی۔ میں جب بھی اسے چھو لیتا وہ برہم سی نظر آتی تھی۔

”بولو ناں۔ تم بال کھولتی کیوں نہیں ہو؟“

”بہت گھنے ہیں ناں۔ اُلجھ جاتے ہیں۔“ وہ دھیرے سے بولی اور سامنے پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھنے لگی۔

”اور ہم جو اُلجھ گئے ہیں تمہاری اس لٹ میں محترمہ ربیعہ انصاری۔“ میں دھیرے سے ہنسا۔ ”ہمیں تو آزاد کرو ناں!“

اس نے شکایتی نظروں سے مجھے دیکھا۔

”میں نے آپ کو کب کہا کہ آپ میرے قیدی ہیں۔ آپ تو آزاد ہیں۔“

”صیاد اپنا قصور نہ بھی مانے صیاد ہی رہتا ہے۔“

”آپ۔ آپ بہت عجیب آدمی ہیں منہاج۔“

”کیوں۔ میرے دو سینگ ہیں؟“ میں نے حیرانی سے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”آپ نے کس طرح سے یہ سارا کھیل شروع کیا میری سمجھ سے باہر ہے۔ نجانے کیسے یہ سب کچھ شروع ہو گیا۔ میں کیسے آپ سے ملنے لگی۔ ہمارے درمیان ایک عجیب سا رشتہ کیسے پیدا ہو گیا۔ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا منہاج!“

”محبت کہتے ہیں اسے جانِ من۔“ میں ہنسا۔ ”اور یہ ایسے ہو جاتی ہے۔ بنا بتائے، بنا سمجھائے!“

”مجھے ان فضول ناموں سے مت پکارا کریں۔“ وہ ناراض ہوئی۔

”کیوں؟ کیا ہرج ہے اس میں۔ زندگی ہی تو بن گئی ہو میری!“

”تو پھر!“ وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔

میں خاموش ہو کر قدموں تک آتی لہر کو دیکھنے لگا۔ میں جانتا تھا اس کے لبوں پر کس سوال نے آ کر دم توڑا

Scanned with CamScanner

تھا۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ اگر میں اسے اتنا ہی چاہنے لگا ہوں تو پھر اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتا۔

وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ اگر وہ میری زندگی بن گئی ہے تو پھر دولت اب تک میری مجبوری کیوں بنی ہوئی ہے۔ میں غربت سے بیزار ہوں تو اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتا تاکہ وہ اپنی زندگی بسر کرے اور میں اپنی۔

اور چونکہ میں یہ بھی جانتا تھا کہ ان سارے سوالات کا واحد جواب خاموشی ہے لہٰذا میں اس سے یہ پوچھے بغیر کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے، خاموش ہی رہا۔

کبھی کبھی مجھے اس پر ترس آتا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں اسے استعمال کر رہا ہوں۔ اپنی وقتی خوشیوں کے لیے اسے اس کی آئندہ آنے والی خوشیوں سے محروم کر رہا ہوں۔

میں نے اسے سکون آور دوائی سمجھ لیا تھا۔ شراب کا جام سمجھ کر قطرہ قطرہ پی رہا تھا اور خود کو زندگی کے غموں سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وہ سکون آور دوائی یا شراب کا پیالہ نہ تھی۔ وہ ایک عورت تھی۔ زندگی کی تمام تر خواہشوں سے بھری ہوئی۔ میری جز وقتی خوشیوں اور خدا سی تسکین کے لیے وہ اپنی ساری عمر کو داؤ پر لگا رہی تھی۔

لیکن میں کرتا بھی کیا۔ وہ میری اشد ضرورت بن گئی تھی۔ مجھے یوں لگتا کہ میں برسوں کا افیمی ہوں اور وہ میری افیم کی پڑیا ہے۔ یہ جانتے بوجھتے بھی کہ یہ سب برا ہے میں اسے استعمال کرتے رہنے پر مجبور تھا۔ میں نے ایک طویل عرصے کے بعد خوشیوں کا مزا چکھا تھا۔ میں اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ اس خیال سے ہی میرے اندر نہیں، نہیں، نہیں کی گردان شروع ہو جاتی تھی۔ اور اس طاقت ور آواز کو دبانا میرے بس سے باہر تھا۔

"سر، یہ پیپرز ٹائپ ہو گئے ہیں۔"

اس نے چند کاغذات میری جانب بڑھائے۔

"میں آج ذرا جلدی جانا چاہتی ہوں۔"

میں نے فائل پر سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ آج پھر اس نے آسمانی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

"یہ رنگ کس کو اچھا لگتا ہے؟" میں نے اسے چھیڑا۔ "اکثر پہنتی ہو۔"

"جس کو پسند تھا اب وہ یہاں نہیں ہے۔" وہ دھیرے سے ہنس دی۔ "میں اس لیے پہنتی ہوں کہ مجھے خود کو بھی یہ رنگ پسند ہے۔"

میرا دھیان اس کے پہلے جملے میں اٹکا ہوا تھا۔

"جلدی کیوں جانا ہے؟" پھر میں نے سر جھٹک کر پوچھا۔

"کچھ شاپنگ کرنی ہے۔"

"شاپنگ آفس ٹائم کے بعد نہیں ہو سکتی؟" میرا لہجہ سنجیدہ تھا۔ "مجھ سے میری محبت کا خراج یوں وصول کرتی ہو، چھٹیاں مانگ کر۔"

اس کا چہرہ یکدم تپ گیا۔ کانوں کی لوؤں تک سرخ انگارہ ہو گیا۔ پھر وہ بنا کچھ کہے اپنی سیٹ کی جانب مڑ گئی۔

"موم کی گڑیا۔" میں نے سوچا۔ دراصل وہ اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ میں اسے جانے کی اجازت دے ہی نہیں سکتا تھا۔

آفس کا ٹائم ختم ہوا تو وہ اٹھ کر اپنی چیزیں اپنے ہینڈ بیگ میں غصے سے ٹھونسنے لگی۔ میرا کام تو کب کا ختم ہو چکا تھا۔ میں تو بے فکری سے بیٹھا اسے کام کرتا دیکھ رہا تھا۔ جب وہ اٹھ کر جانے لگی تو میں بھی کھڑا ہو گیا۔

میرے ساتھ ساتھ چلنا اس کی مجبوری بن گیا۔ لیکن باہر آ کر اس نے راستہ بدل لیا۔ میں لفٹ کی جانب بڑھا تو وہ سیڑھیوں کی طرف مڑ گئی۔

میرے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ لیکن میں نے اسے روکا نہیں۔

ہانپتی کانپتی جب وہ لال چہرا لیے آخری سیڑھی پر آئی تو میں ریلنگ سے ٹیک لگائے اس کا منتظر تھا۔

"لو کچھ سر دیا!" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

وہ جواب دیے بنا آگے بڑھ گئی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ باہر نکل کر میں پارکنگ ایریا کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے پتا تھا اس کی مطلوبہ بس دس منٹ بعد آتی ہے۔

اطمینان سے گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا میں اس کے

قریب سے آیا اور فرنٹ ڈور کھول دیا۔ لازمی امر تھا کہ وہ اتنے لوگوں کے سامنے تماشا بننا نہیں چاہتی تھی، سو اسے بیٹھنا پڑا۔

"کہاں چلیں؟" میں نے پوچھا۔

"جہنم میں۔" وہ تڑخ کر بولی۔

"نہیں بھئی۔" میں نے ڈرنے کی اداکاری کی۔ "اب ایسے بھی حالات نہیں۔"

"منہاج صاحب!" اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ "گاڑی روکیں۔"

"نہ روکوں تو؟"

"تو میں دروازہ کھول کر کود جاؤں گی۔" وہ جھلائی۔

"سوچ لو۔ تمہیں چوٹیں آئیں گی، شاید ہاسپٹل لے جانا پڑے۔ بات پھیلے گی۔ لوگوں کو پتا چلے گا کہ ہم دونوں ساتھ تھے اور ہماری ہاتھا پائی ہو گئی تھی۔ ہم دونوں کی بدنامی ہو گی۔ تمہیں اس کا ڈر نہیں ہے؟"

"میں آپ کی طرح ڈرپوک نہیں ہوں۔" وہ آنکھوں میں اترتی نمی پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ "بزدل۔"

میں چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔

"نجانے میں کیوں ملتی ہوں آپ سے۔ نجانے مجھے کیا ہو گیا ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

"محبت!" میں دھیمے سروں میں بولا۔

"نہیں۔" وہ تڑخ کر بولی۔ "میں آپ سے محبت نہیں کرتی۔"

"پھر کس سے کرتی ہو؟" میں نے سکون سے پوچھا۔ "اس سے جسے آسمانی رنگ پسند ہے؟"

"ہاں۔ منگیتر ہے وہ میرا۔"

میرے اندر کئی چھناکے ہوئے لیکن میں خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔ میرا اس پر کوئی حق نہ تھا۔ وہ کسی کو بھی چاہنے کا دعوا کر سکتی تھی۔ میں اس سے بازپرس کرنے کا مجاز نہ تھا۔ وہ کسی بھی لمحے مجھے چھوڑ کر جا سکتی تھی۔ میں اسے پکارنے کا جواز نہ رکھتا تھا۔ میرے اندر ان سب سوچوں نے دھواں سا بھر دیا۔

"میرے منگیتر کا نام فصیح ہے۔" وہ میری اداسی کو محسوس کر کے دھیرے سے بولی۔

"ہو گا۔" میں خشک لہجے میں بولا۔

"امی کے انتقال سے دو تین سال قبل ہماری منگنی ہوئی تھی۔" وہ شاید مجھے سب کچھ بتانے کا تہیہ کر چکی تھی۔ "وہ میری پھوپی کا بیٹا تھا۔ اور ہمارے ساتھ ہی رہتا تھا۔ پھر اس پر کچھ بننے کی دھن سوار ہو گئی۔ اور وہ ہمیں چھوڑ کر امریکہ چلا گیا۔ کچھ عرصہ اس کے خطوط آتے رہے پھر علم ہوا کہ گرین کارڈ حاصل کرنے کے لیے اس نے وہاں کسی عورت سے شادی کر لی ہے۔"

"اور آپ اب تک اسے اپنا منگیتر سمجھتی اور پکارتی ہیں۔" میں طنزیہ لہجے میں بولا۔

"آپ کو تو طنز سے سخت نفرت ہے ناں۔" وہ دکھی انداز میں بولی۔

میں شرمندہ سا ہو گیا۔

"جینے کے لیے بہانوں کی ضرورت ہوتی ہے منہاج صاحب۔" پھر وہ بولی۔ "اور بہانے تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کھوکھلے اور بے جان۔ لیکن ان کے دم سے زندگی تو چلتی رہتی ہے ناں۔"

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو ربیعہ۔"

اس نے وہ سب کہا تھا جو خود میرے دل میں تھا۔ ہم دونوں دو علیحدہ علیحدہ راستوں کے راہی تھے جو کیلے پن کے خوف سے ساتھ ہو لیے تھے۔ بالآخر کسی مقام پر ہمیں بچھڑنا تھا۔ ہم دونوں ہی جانتے تھے۔

"کیا خریدو گی؟"

مارکیٹ کا رخ کرتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"تھوڑی سی خوشیاں، ذرا سی بے فکری، چند مسکراہٹیں۔"

میں نے اس کی سمت دیکھا اور مسکرا دیا۔

"اور دکان والے کو کیا دو گی؟"

"یہی سب کچھ۔"

ہم دونوں ہی ہنس دیے۔

میں دروازہ کھول کر لاؤنج میں داخل ہوا تو ایک لمحے کے لیے چکرا سا گیا۔ چھت پر، دیواروں پر تاتین

Scanned with CamScanner

پڑے۔ ہر جانب پھول ہی پھول تھے۔ تازہ گلابوں کی خوشبو سے پورا گھر مہک رہا تھا۔

"کیا میں کسی اور کے گھر میں آگیا ہوں۔"

چند ثانیوں کے لیے میں واقعی گھبرا گیا لیکن پھر فرنیچر اور دیگر چیزوں نے احساس دلایا کہ گھر اپنا ہی ہے۔ تعجب سے یہ سب کچھ دیکھتا ہوا میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر مجھے ایک اور جھٹکا لگا۔ گلابوں نے یہاں بھی ڈیرا جمایا ہوا تھا۔

"یہ گھر ہے یا گلاب کا کھیت۔" میں بڑبڑایا۔

اسی وقت باتھ روم کا دروازہ کھلا اور عنبرین گنگناتی ہوئی باہر نکلی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرا دی۔ (مجھے آنکھوں پر یقین آ گیا)

"آج بڑی دیر کر دی۔" وہ گیلے بالوں کو تولیے سے خشک کر رہی تھی۔

میں نے رسٹ واچ دیکھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ دیگر دنوں کی نسبت آج میں کچھ جلدی آ گیا تھا۔

"کیا بات ہے، یہ ایک جگہ منجمد کیوں ہو گئے؟" وہ آئینے میں میرا عکس دیکھ کر مسکرائی۔

"آنکھوں پر یقین آتا ہے نہ کانوں پر۔" میں نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے سانس بھری۔ "نہ یہ کمرا مانوس نظر آتا ہے نہ تمہاری گفتگو۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"اچھا جلدی سے چینج کریں میں کھانا لگاتی ہوں جانتے نہیں آج میں نے آپ کے لیے چائنیز کھانا بنایا ہے۔"

وہ مجھ سے گفتگو کے لیے "آپ" کا لفظ استعمال کر رہی تھی۔ حیرت سے میری آنکھیں مزید پھیل گئیں۔

"یا خدا۔ یہ آج سورج کہاں سے نکلا تھا۔ میں نے صبح غور کیوں نہیں کیا؟"

سوچتا ہوا میں باتھ روم میں گھس گیا۔ نہا دھو کر باہر نکلا تو وہ کھانا لگا چکی تھی۔

ہر چند کہ میں ربیعہ کے ساتھ کھانا کھا کر آیا تھا۔ لیکن ایک مرتبہ پھر کھانے بیٹھ گیا کہ انکار کا تو آج کوئی سوال ہی نہ تھا۔

کھانے کے بعد وہ مجھے کمرے میں چلنے کا کہہ کر کافی بنانے چلی گئی۔ اس نے سارے نوکروں کو چھٹی دی ہوئی تھی اور گھر میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔

میں کمرے میں آ کر بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ آنکھیں بند کر کے اس نئی تبدیلی کے بارے میں سوچنے لگا جو قطعاً غیر متوقع تھی۔

کچھ دیر بعد مجھے ہاتھ پر نمی کا احساس ہوا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ میرے قدموں میں بیٹھی تھی، سر جھکائے آنسو بہا رہی تھی جو میرے ہاتھ کی پشت پر گر رہے تھے۔

"عنبرین۔ کیا ہوا ہے؟" میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "یار۔ کچھ بتاؤ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

"پاگل تو میں ہو گئی تھی منہاج۔ اپنے ہاتھوں اپنا گھر اجاڑنے چلی تھی۔" وہ سسکی۔ "مجھے احساس ہو گیا ہے کہ میں غلطی پر تھی۔ پانچ سال سے آپ کی زندگی عذاب کر رکھی ہے میں نے۔ نہ صرف آپ کی بلکہ ہم دونوں کی۔ مجھے میرے رویے کی بدصورتی کا احساس ہو گیا ہے منہاج مجھے معاف کر دیں۔"

"جب تمہیں احساس ہو ہی گیا ہے تو معافی کا کیا سوال۔" میں مسکرایا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے برابر بٹھا لیا۔

"دیکھو عنبرین! اب اس روش کو پھر کبھی مت اپنانا جس نے ہماری اچھی بھلی زندگی کے پانچ بہترین سال ہم سے چھین لیے۔"

"میرا اتنا قصور ہے منہاج۔ کہ میں آپ سے انتہائی شدت سے محبت کرتی ہوں۔ اور مجھے یہ خوف رہتا ہے کہ آپ کبھی مجھے چھوڑ کر کسی اور کو نہ اپنا لیں۔"

"اور ان بے بنیاد بدگمانیوں پر تم بے اعتباری کی عمارت کھڑی کرتی چلی گئیں۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں، میں آئندہ آپ پر کبھی شک نہیں کروں گی۔"

"میں بھی وعدہ کرتا ہوں عنبرین۔ جو تمہاری جگہ

Scanned with CamScanner

ہے، وہ صرف تمہاری رہے گی۔"

"پھر۔" وہ کچھ کہتے کہتے رہ گئی۔

"ہاں کہو۔"

"پھر ربیعہ انصاری کو فوراً سے بیشتر اپنے دفتر سے نکال باہر کریں۔"

میں ششدر رہ گیا، لیکن صرف چند ثانیوں کے لیے۔ پھر میں واپس اپنی سابقہ حالت میں لوٹ آیا۔ ربیعہ انصاری اور میرا تعلق اب کوئی راز نہ رہا تھا۔ دفتر میں۔ دفتر سے باہر بہت سے لوگ تھے، جو ہمیں کئی مقامات پر ساتھ دیکھ چکے تھے۔ ایسے میں عنبرین جیسی جاسوس فطرت عورت سے یہ بات چھپی رہنا ممکن بھی نہ تھا۔

"ربیعہ انصاری! وہ محض ایک سایہ ہے عنبرین۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "اس سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔"

"میں کسی سے خوفزدہ نہیں ہوں۔" اس نے ناک سکوڑی۔ "لیکن یہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے منہاج۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ اس مسئلے کو فی الوقت موضوع بحث نہ بناؤ۔ یہ وقت تو اچھی اچھی باتیں کرنے کا ہے۔"

نجانے وہ کس دل سے مسکرائی تھی۔

جس طوفان کے اٹھنے سے میں دل ہی دل میں انتہائی خوفزدہ تھا، وہ اگر اس خاموشی سے گزر جائے گا میرے تصور میں بھی نہ تھا۔ میں سوچتا تھا کہ وہ جو ہوائی قلعے بنا کر جنگ لڑا کرتی تھی جب حقیقی قلعہ دیکھے گی تو اس کا کیا حال ہوگا۔ لیکن ہوا یوں کہ اس نے پسپائی اختیار کر لی۔ یہ میرے لیے زندگی کی حقیقی خوشیوں کی نوید تھی۔

"کل آپ کی سالگرہ ہے۔ کیا آپ کو یاد ہے؟"

کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔

"اچھا!" میں نے تعجب سے سوچا۔ "میں تو سمجھ رہا تھا کہ آج میری سالگرہ ہے۔ یہ اتفاق، یہ التفات!"

وہ ہنس دی۔

"سچ بتاؤں منہاج! میں ماہرِ نفسیات سے ملی تھی۔"

"ہائیں وہ کیوں!" میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"میں جاننا چاہتی تھی کہ میری زندگی اس قدر بے کیف کیوں ہے۔ میرے پاس محبت کیوں نہیں ہے، خلوص، اعتبار، اعتماد سے میرا دامن کیوں اتنا خالی ہے۔ ایک ہفتے کے علاج سے ہی مجھ پر یہ بات روشن ہو گئی کہ سارا قصور میرا اپنا ہے تمہیں کھو دینے کے خوف کی انتہا پر جا کر میں خود بخود تمہیں کھو بیٹھی تھی۔ تم دوسروں کے ہو رہے تھے۔ یہ بات سمجھ میں آتے ہی سارے کام خود بخود بنتے چلے گئے۔ اور دیکھ لو آج ہم ایک دوسرے کے کتنے قریب آ گئے ہیں۔"

"اور تم وعدہ کر چکی ہو کہ اب دور نہیں جاؤ گی۔"

"وعدہ تو تم نے بھی کیا ہے ایک مجھ سے۔" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

میں نے جلدی سے نظریں جھکا لیں مبادا وہ ان میں ربیعہ انصاری کا عکس نہ پا لے۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ نگاہیں تو تب جھکتی ہیں جب دل میں چور ہو۔

"چور تو تم ہو ربیعہ۔ کتنی صفائی سے میرے دل پہ ہاتھ صاف کر گئی ہو کہ میں اپنی بیوی کے ساتھ ہو کر بھی تمہیں سوچتا ہوں۔"

"کیا سوچنے لگے؟"

"آں۔" میں چونکا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ کل میری سالگرہ ہے اور تحفہ تم نے مجھے آج دیا ہے۔ سچی خوشیوں کا تحفہ۔"

"کل ہم باہر کھانا کھائیں گے۔" وہ خوش ہو کر جلدی سے بولی۔

"ٹھیک ہے۔" میں بھی مسکرا دیا۔

"کل تم آفس سے بھی چھٹی کر لو۔"

"ٹھیک ہے۔" مجھے ہامی بھرنی پڑی۔

وہ خوش تھی اور مجھے اس کی خوشی کا پاس کرنا تھا کہ بہرحال وہ میری پہلی اور آخری بیوی تھی۔ اور یہ فیصلہ تو میں بہت پہلے کر چکا تھا۔

دوسرا دن مصروف گزرا۔ عنبرین نے مجھے پورا دن مصروف رکھا۔ صبح وہ مجھے شاپنگ پر لے گئی

اور مجھے ڈھیروں ڈھیر چیزیں دلائیں۔ لنچ ہم نے ہوٹل میں کیا۔ پھر ہم گھومنے ساحل سمندر پر گئے جہاں سے رات گئے کھا پی کھا کر لوٹے۔

شاید وہ شعوری طور پر مجھے ذہنی طور پر خود سے قریب کرنا چاہ رہی تھی۔ یعنی وہ پانچ سال کی کسر ایک ساتھ نکال لینا چاہتی تھی جس سے میں تھکن محسوس کر رہا تھا۔

رات کو تھک ہار کر جب میں بستر پر لیٹا تو میرا ذہن جسم کی تھکاوٹ سے قطع نظر بالکل چوکس تھا۔ میں سوچنا چاہتا تھا۔ میں خود کو جاننا چاہ رہا تھا۔ میری اپنی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ میں ربیعہ کو چاہتا تھا۔ یہ ایک قطعی بات تھی جس میں شک و شبہ کی تو کوئی بات ہی نہ تھی لیکن میں اسے اپنا نہیں سکتا تھا۔ یہ بات بھی طے تھی۔ میرے پاس جو کچھ بھی تھا وہ سب عنبرین کا تھا۔ عنبرین کو چھوڑ کر میں عرش سے فرش تک کا فاصلہ محض ایک قلابازی میں طے کرتا جو کہ مجھے منظور نہ تھا۔ غم جاناں قابل برداشت تھا۔ غم دوراں ناقابل برداشت ہوتا اور پھر عنبرین کو چھوڑ کر میں ربیعہ کو اپنا بھی لیتا تو شاید ہمارے بیچ ایسے ہی جھگڑے ہوا کرتے۔ مجھے جب جب یہ احساسات یاد آتیں میں غیر شعوری طور پر اسے معتوب ٹھہراتا۔

یہ سب کچھ سمجھتے ہوئے، جانتے ہوئے، ہونا یہ چاہیے تھا کہ میں ربیعہ سے کنارہ کش ہو جاتا۔ لیکن کم بخت دل اس پر بھی راضی نہ ہوتا تھا۔

بہرحال، ہونا یہی تھا۔ آج یا کل۔ مجھے ربیعہ سے علیحدہ ہونا تھا۔ اسی میں میری بہتری تھی۔ میرے بہتر مستقبل کی ضمانت تھی۔

"آئی ایم سوری ربیعہ۔" میں نے سونے سے قبل اس کے تصور کو مخاطب کیا۔ "یقین کرو اسی میں ہماری بھلائی ہے۔"

دوسرے دن وہ کچھ خاموش خاموش سی تھی۔ اس کی ٹائپ رائٹر پر تھرکتی انگلیاں بار بار رکتیں۔ وہ کچھ سوچتی اور پھر ٹائپ رائٹر کی کھٹ کھٹ شروع ہو جاتی۔

"کہاں گم ہو؟"

وہ مجھے پیپرز پکڑانے لگی تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔

"سر پلیز! مجھے ابھی بہت کام ہے۔"

"کیا بات ہے ربیعہ؟"

"کوئی بات نہیں۔"

"اتنی اکھڑی اکھڑی کیوں ہو؟"

وہ خاموش کھڑی رہی۔

"منہاج صاحب۔" پھر وہ بولی۔ "میں یہ نوکری چھوڑ رہی ہوں۔"

میرے حواسوں پر ایک بم گرا۔

"کیوں؟"

"میں اب آپ کے ہاتھوں مزید کھلونا بننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

"کھلونا۔ کیسا کھلونا۔" میں پریشان ہو گیا۔ "کیوں پہیلیاں بجھوا رہی ہو۔"

"آپ۔ آپ مجھے شاید ایک گڑیا سمجھتے ہیں۔ جس سے جب جی چاہا کھیل لیا۔ جب جی چاہا اٹھا کر کونے میں ڈال دیا اور شوکیس سے دوسری گڑیا نکال لی۔"

"ہاں گڑیا تو میں تمہیں سمجھتا ہوں۔" میں نے آہستگی سے اس کا رخ اپنی جانب موڑا۔ "اس لیے کہ تم لگتی بالکل گڑیا جیسی ہو۔ کبھی کانچ کی، کبھی موم کی۔ اور اس وقت بالکل پتھر کی گڑیا لگ رہی ہو۔ لیکن یہ کھیلنے اور ایک طرف رکھ دینے والی بات کیا ہے؟ اور یہ دوسری گڑیا کون ہے؟"

"آپ کی بیگم محترمہ عنبرین احمد۔" وہ تلخ لہجے میں بولی۔ "میں نے آپ دونوں کو وہاں سیر کرتے دیکھا تھا جہاں آپ مجھے لے جاتے ہیں۔ اور آپ بے حد خوش نظر آتے تھے! آپ تو کہتے ہیں کہ آپ دونوں صرف نام کے میاں بیوی ہیں۔ آپ دونوں کے درمیان محبت، خلوص اور یقین کا کوئی رشتہ نہیں پھر وہ سب کیا تھا؟ لو برڈز کی طرح سر ملائے کون سے وعدے وعید ہو رہے تھے؟"

Scanned with CamScanner

"اوہ!" میں گہری سانس بھر کر کرسی پر گر گیا۔

"میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔" وہ آنکھوں میں بھر آنے والے آنسوؤں کو حلق میں اتارتے ہوئے بولی۔ "میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپ سے علیحدہ ہونا چاہتی ہوں۔"

مجھے یوں لگا اس نے مجھے ایک گہرے پاتال میں دھکیل دیا ہو۔ نہیں، نہیں، نہیں کی گردان ایک بار پھر اسی شدت سے شروع ہو گئی۔ نجانے کیا بات تھی، جب میں خود اپنا سوچتا، اس آواز میں اتنی شدت نہ ہوتی اور جب وہ یہ بات کرتی میں بے حال ہو جاتا۔

"ربیعہ۔ ربیعہ۔ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا!" میں بے بسی سے بولا۔

اس کا چہرا سرخ ہو گیا۔ وہ میری جانب مڑی اور بولی۔

"منہاج صاحب! میں طوائف نہیں ہوں!"

پھر وہ اپنا بیگ اٹھا کر بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ میں پتھر کے بت کی مانند بیٹھا رہ گیا۔ غلطی میری ہی تھی۔ نہ میں اسے اپناتا تھا، نہ چھوڑتا تھا۔ اور وہ اتنی خوددار تھی۔ کہ اس نے مجھ سے آج تک اپنے منہ سے شادی کے لیے نہ کہا تھا۔

اس کی آنکھیں، اس کی ناک کی بناوٹ، اس کے لبوں کا کٹاؤ۔ میں نے تو پہلے دن ہی سارے اندازے درست لگائے تھے پھر میں غلطی پر غلطی کیوں کرتا رہا۔

میں تھکے ہارے انداز میں اٹھا اور اپنا کوٹ اٹھا کر آفس سے نکل گیا۔

"تم نے ربیعہ سے شادی کر لی ہے؟"

یہ پہلا سوال تھا جو گھر میں گھستے ہی مجھ سے کہا گیا۔ میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

"کون بکتا ہے؟"

"لوگ بکتے ہیں۔" وہ چلائی۔ "آخر تم اسے دفتر سے نکالتے کیوں نہیں؟"

"دفتری معاملات میں مداخلت تمہارا کام نہیں ہے۔" میں چلایا۔ "میں خود بہتر جانتا ہوں مجھے کس کو رکھنا ہے، کس کو نکالنا ہے۔"

"منہاج! میں نے پیار محبت سے تمہیں راہ راست پر لانے کی کوشش کی لیکن میں جان چکی ہوں کہ تم سدھرنے والی چیز نہیں ہو۔ آج تم دفتر گئے تو میں خوش تھی کہ واپسی پر تم مجھے اسے نکالنے کی خوشخبری دو گے لیکن پیچھے سے وہ منحوس مسز عثمانی فون کر کے بتا رہی ہیں کہ تم نے اس چڑیل سے شادی کر لی ہے۔"

"گلا گھونٹ دوں گا میں ان کا بھی تمہارا بھی!"

حالانکہ میں ذہنی طور پر خود کو ربیعہ سے الگ ہونے پر تیار کر چکا تھا لیکن اس از سر نو بحث نے مجھے الجھا دیا۔ مجھے خود پر قابو نہ رہا۔

"تم۔ تم کیا میرا گلا گھونٹو گے۔ کیا ہو تم جس پر اتراتے ہو۔ میں ہر چیز چھین سکتی ہوں تم سے۔ تم جانتے ہو۔"

"کیا چھین سکتی ہو تم؟ میری زندگی؟ میری خوشیاں؟ میری نیند؟ سکون؟ نہیں عنبرین احمد! تم کچھ نہیں چھین سکتیں یہ میری مروت تھی جو میں آج تک خاموش رہا لیکن اب! میں خود چھوڑ دوں گا تمہیں۔ تمہاری دی ہوئی ہر شے کو ایک ٹھوکر مار کر واپس تمہارے قدموں میں ڈال دوں گا۔ اور یقین کرو۔ ربیعہ انصاری کے ساتھ میری زندگی بہت خوشگوار گزرے گی۔"

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتی رہ گئی اور میں کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھتے اپنے کمرے میں گھس گیا۔

"زندگی تمہاری مرہون منت ان آسائشات کے بغیر بھی گزر سکتی ہے عنبرین احمد۔" میں تیار ہوتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ "ملتا ہی کیا ہے ٹنڈ منڈ ہو کر ایک ویل فرنشڈ آفس میں بیٹھنے سے۔ انسان دو روٹی کھا کر چین اور سکون کی نیند سو لے یہ کہیں بہتر ہے۔ اس سے کہ ایک لاکھ کے پلنگ پر پوری رات جاگ کر گزار دی جائے۔"

کمرے سے باہر نکل کر میں نے اس کے کمرے کے بند دروازے پر نگاہ ڈالی۔

"گڈ بائے۔"

میں باہر نکل آیا۔ ٹیکسی کر کے میں سیدھا ربیعہ انصاری کے ہاسٹل پہنچا تھا۔

Scanned with CamScanner

"مس ربیعہ انصاری؟" آفس میں بیٹھی عورت نے مجھے دیکھا۔ "آپ انہیں سے ملنا چاہتے ہیں ناں!"

"جی جی۔ میں نے یہی نام لیا ہے۔" نجانے کیوں میرا اندر بہت بے چین تھا۔

"آپ بڑے وقت پر آئے ہیں۔ وہ تو بس کمرا خالی کر کے جانے ہی والی تھیں۔ اپنا سامان تیار کر رہی ہیں وہ۔"

"اوہ!" میں نے سکون کا گہرا سانس لیا۔

نجانے وہ کہاں چلی جاتی اور پھر کبھی مجھے ملتی بھی یا نہیں۔ میں عین وقت پر پہنچا تھا۔

ربیعہ اندر داخل ہوئی تو وہ عورت رسماً مسکرا کر باہر چلی گئی۔

"آپ!" مجھے دیکھ کر اسے جھٹکا لگا۔ "اس وقت؟"

"ربیعہ۔ چلو شادی کر لیں۔"

"مگر کیوں؟" وہ ایک لمحے کے لیے گھبرا سی گئی۔

"جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ میری قوت برداشت سے باہر ہے۔ اس لیے۔"

"جو کچھ ہو چکا ہے اس کا علم غالباً آپ کو نہیں ہے۔" اس کا چہرا نجانے کیوں سرخ ہو گیا۔

"کیا ہو چکا ہے؟" میں نے حیرانی سے اس کی صورت دیکھی۔

"فصیح واپس آ گیا ہے اور آج ہم دونوں شادی کر رہے ہیں۔"

میں ساکت رہ گیا۔ چند لمحوں کے لیے دماغ نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ الفاظ اور معانی سب آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔

"کیا۔ کیا کہا؟"

"مجھے یقین تھا۔ ایک روز وہ ضرور لوٹے گا۔" وہ میز پر انگلی سے لکیریں کھینچنے لگی۔ "اور وہ لوٹ آیا ہے۔ صرف میرے لیے۔"

"تمہیں یقین تھا کہ وہ لوٹے گا۔" میں حیرانی سے اس کا چہرا تک رہا تھا۔ "تمہیں یقین تھا ربیعہ اور۔ اور تم مجھ سے۔ میرے جذبات سے کھیلتی رہیں؟ اس کی محبت کی صداقت پر اس قدر ایمان تھا تو میرے راستے کیوں کھوٹے کیے؟ جب تمہیں یقین تھا کہ تم میرے لیے نہیں ہو۔ تو کیوں آئی تھیں میرے اتنے قریب؟ کیوں چھائیں میرے حواسوں پر؟"

"ربیعہ بی بی۔" چوکیدار نے آ کر دروازہ بجایا۔ "باہر آپ کی گاڑی آ گئی ہے۔ صاحب بلا رہے ہیں آپ کو۔"

"منہاج صاحب۔" وہ اپنا بیگ اٹھا کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "میں آپ کے ہر سوال کا جواب دے سکتی ہوں لیکن سچ اگر الفاظ میں بیان نہ کیا جائے، تب بھی سچ ہی رہتا ہے۔ آپ غور کیجیے گا۔ ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔"

پھر وہ مڑی اور باہر نکل گئی۔ میں ہونقوں کی طرح ہاسٹل کے آفس میں تنہا کھڑا رہ گیا۔

"ہاں ربیعہ۔" پھر میں نے سوچا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو۔ غور کرو تو ہر سوال کا بڑا واضح، بڑا سچ جواب نکلتا ہے۔ مجھے شکایت ہے کہ تم نے مجھ سے، میرے جذبات سے کھیلا، یہ شکایت تم مجھ سے بہت پہلے کر چکی ہو۔ مجھے شکایت ہے کہ جب تمہاری منزل کوئی اور تھی تو تم میرے ساتھ کیوں چل رہی تھیں، یہ الزام تم بھی مجھ پر عائد کر سکتی ہو۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے شجر سایہ دار تھے۔ جن کے پاس کچھ دیر ٹھہر کر سستایا جا سکتا ہے۔ ان کے نیچے بسیرا نہیں کیا جاتا۔ بات بس اتنی سی ہے ربیعہ کہ ساتھ ساتھ چلنے میں تمہاری منزل پہلے آ گئی اور تم نے مجھے خدا حافظ کہہ دیا۔ میری منزل قریب تھی تو میں نے بھی یہی کہنے کا سوچا تھا۔"

میں نے کھڑکی کے قریب آ کر باہر جھانکا۔ کوٹ پینٹ میں ملبوس ایک جوان اس کے ہاتھ سے اس کا بیگ لے رہا تھا۔ ربیعہ انصاری کسی روبوٹ کی طرح اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

"اور منہاج احمد۔ تمہاری منزل اگر پہلے آ جاتی تو؟" میں نے ایک گہری سانس بھری اور میرے ذہن نے ابھی ابھی دیکھے گئے منظر کے لیے عنوان تجویز کیا۔

"تو۔ تم بھی تو یہی کرتے۔"

پھر میں مڑا اور سر جھکا کر باہر نکل گیا۔

Scanned with CamScanner